اکبر الٰہ آبادی

صغرا مہدی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اکبر الہٰ آبادی

صغرا مہدی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی ـ 110025

پہلی اشاعت	:	1983
تیسری طباعت	:	2011
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/10 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	303

Akbar Allahabadi
by
Sughra Mehdi

ISBN :978-81-7587-361-2

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025 فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho(Top) کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

پہلا باب

پیدائش اور بچپن

مقامات کو خوبصورت بناتے ہیں وہاں کے قدرتی مناظر اور انھیں شہرت ملتی ہے اپنے نامور باشندوں سے، کتنے ہی مقام ایسے ہیں جو اس لیے مشہور ہیں کہ وہاں کی سرزمین سے بڑے بڑے ادیب، سیاست داں اور عالم و فنکار پیدا ہوئے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کا شمار بھی ایسی ہی بستیوں میں ہوتا ہے۔

الٰہ آباد کے ضلع میں ایک چھوٹی سی تحصیل ہے بارہ۔ اکبر ۱۶؍نومبر ۱۸۴۶ء کو یہاں پیدا ہوئے۔ اُس دن عید کا دن تھا۔ اکبر کے والد تفضّل حسین، اپنے بڑے بھائی وارث علی کے ساتھ رہتے تھے، جو بارہ میں تحصیلدار تھے۔

اکبر کی پیدائش کے کچھ دن بعد ان کے خاندان کے لوگ داؤد نگر ضلع گیا (بہار) چلے گئے جہاں اکبر کے دادا یعنی ان کے والد کے چچا رہتے تھے۔ اکبر کا ابتدائی بچپن داؤد نگر ہی میں گذرا۔ یہیں پر ان کی بسم اللہ[1] کی رسم ادا ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر پانچ یا چھ سال کی تھی۔ انھوں نے پڑھنا

---

[1] پرانے زمانے میں مسلمانوں میں جب بچے کی تعلیم شروع ہوتی تو سب سے پہلے گھر کا کوئی عالم بزرگ یا پھر کوئی مولوی آکر بچے کو قرآن کی سورت پڑھاتا۔ جس بچے کی بسم اللہ ہوتی ہے اس کے نئے کپڑے بنائے جاتے ہیں۔ رشتہ داروں اور دوستوں کو بلایا جاتا ہے اور دعوت ہوتی ہے۔

شروع کیا تو یہ اندازہ ہوا کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہیں اور یاد داشت بہت اچھی ہے. پڑھنے کے شوقین ہیں۔ مذہبی تعلیم کے علاوہ فارسی عربی اور اُردو کے ساتھ ان کو ریاضی کی تعلیم بھی پڑھائی جانے لگی۔ اکبر کے والد تفضل حسین ریاضی کے ماہر تھے۔ وہی اکبر کو پڑھاتے تھے۔ انھیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان کا بیٹا بھی حساب سیکھنے میں تیز ہے۔

اکبر کے ایک چھوٹے بھائی اکبر حسن اور ایک بہن سیدہ تھیں. یہ اپنے دونوں بھائی بہن کو بہت چاہتے تھے، کیوں کہ وہ ان دونوں سے بڑے تھے۔ اس لیے ہمیشہ ان کا بہت خیال کرتے۔ ان کی ماں بہت نیک ، خدا پرست اور دین دار خاتون تھیں۔ انھوں نے بچپن سے اکبر کے دل میں مذہب سے لگاؤ پیدا کیا اور مذہبی فرائض کی اَدائیگی کی عادت ڈالی۔

بچپن میں اکبر کو دو کھیل بہت پسند تھے، ایک تو کبڈی، دوسرے جھوٹ موٹ کی عدالتیں بنا کر مقدموں کے فیصلے کرنا۔ دوسرے کھیلوں کا انھیں شوق نہیں تھا. اسی لیے وہ ہمیشہ دُبلے پتلے رہے اور صحت بھی کمزور رہی۔

اکبر کے دادا سید محمد زماں فوج میں صوبیدار تھے اور ان کو خان بہادر کا خطاب بھی ملا تھا. اکبر کے والد سید محمد تفضل حسین نے کچھ دنوں ملازمت کی مگر پھر چھوڑ دی. ان کو تصوّف[1] سے خاص لگاؤ تھا۔ اس لیے وہ تصوّف سے متعلق کتابیں پڑھتے یا خدا کی عبادت میں اپنا وقت گزارتے ان کے بڑے بھائی سید وارث علی اور ان کے چچا فضل الدین نوکری کرتے تھے۔ دادا کا انتقال ہو چکا تھا. کچھ جائیداد تھی. اچھی طرح گذر بسر ہو جاتی تھی۔

اس زمانے میں خاندان کے سب لوگ عام طور پر ساتھ رہتے تھے اور یہ بات ضروری نہیں تھی کہ گھر کے سب افراد کمائیں۔ کچھ جائیدادیں ہوتی تھیں، کچھ لوگ ملازمتیں کر لیتے اور پورے خاندان کی گذر بسر ہو جاتی۔ خاندان کا تصوّر وسیع تھا جس میں دور و نزدیک کے رشتے داروں کے علاوہ گھر کے پلے نوکروں اور برادری کے لوگوں کا شمار بھی ہوتا تھا. گھر کا سب سے بڑا مرد

---

[1] دل میں خدا کی محبت اور اس کے قرب کی خواہش رکھنا۔

اور سب سے بڑی عورت گھر کی ساری ذمّہ داریوں کو اٹھاتے۔ ان کی حیثیت خاندان کے ذمّہ دار کی سی ہوتی۔ اسی لیے جب اکبر کے دادا سید فضل الدین اپنی ملازمت کے سلسلے میں الٰہ آباد آئے تو سارا خاندان اُن کے ساتھ الٰہ آباد آگیا اور پھر یہیں رہنے لگا۔ ان لوگوں کا قیام الٰہ آباد میں چک نام کے محلّے میں تھا۔ یہاں اکبر کے دادا سید فضل الدین نے ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔

اکبر چونکہ شوقین بھی تھے اور ذہین بھی' اس لیے انھوں نے پڑھنا لکھنا جلدی سیکھ لیا۔ قرآن شریف پڑھنے لگے۔ اُردو کی ضخیم¹ داستانیں جیسے الف لیلیٰ. قصّہ حاتم طائی آٹھ سال کی عمر میں انھوں نے ختم کرلی تھی۔ محلّے کی عورتیں اور مرد ان سے خط لکھوانے آیا کرتیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں انگریزوں کی باقاعدہ حکومت تو قائم نہیں ہوئی تھی' مگر اصل میں وہی ہندوستان پر حکمران تھے۔ انھوں نے دھیرے دھیرے یہاں اپنا پورا تسلّط² قائم کرلیا تھا۔ وہ نہ صرف ہندوستان کی حکومت ہتھیانے کی فکر میں تھے بلکہ اس کوشش میں بھی لگے ہوئے تھے کہ ہندوستانیوں کی تہذیب کو ختم کر کے یہاں پر اپنی تہذیب پھیلائیں۔

انگریزی تعلیم کا رواج ہو رہا تھا، اور اب ہندوستانی لوگ بھی یہ ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ اپنے بچوں کو پُرانی وضع کے بجائے انگریزی اسکولوں میں بھیجیں تاکہ وہ انگریزی پڑھ کر اچھی ملازمت حاصل کرسکیں۔ اس لیے اکبر کو بھی دس سال کی عمر میں الٰہ آباد میں جمنا مشن اسکول میں داخل کرادیا گیا۔

اکبر کو یہ اسکول بہت پسند آیا۔ ان کا دل اُس میں لگ گیا۔ اسکول میں یہ بہت اچھے چل رہے تھے۔ ان کے اُستاد ان سے بہت خوش تھے۔ ریاضی میں خاص طور سے اچھے نمبر لاتے تھے۔ مگر یہ سلسلہ ایک سال بعد ختم ہوگیا۔ اس لیے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوگیا یعنی آخری مغل

---

¹ بہت موٹی۔ ² قبضہ

بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کی پہلی کوشش کی تھی جسے انگریزوں نے "غدر" کا نام دیا۔ لیکن دراصل یہ پہلی جنگِ آزادی تھی۔ اس لڑائی میں ہندوستان کے لوگ ہار گئے اور انگریز اب باقاعدہ پورے ہندوستان پر حکومت کرنے لگے۔ انھوں نے ان سب ہندوستانیوں کو سخت سزائیں دیں جنھوں نے اس لڑائی میں حصہ لیا تھا اور جس پر انھیں یہ شبہ بھی ہوگیا کہ یہ لوگ "باغیوں" کے طرفدار ہیں اور انگریزوں کی حکومت نہیں چاہتے ہیں ان پر انھوں نے سخت ظلم کیے۔ ان کی پنشنیں بند کر دیں، جائیدادیں ضبط کرلیں۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ خوف زدہ تھے کہ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ اپنے ہاتھ سے حکومت آسانی سے دینے کو تیار نہیں ہیں۔

اس ہنگامے میں اکبر کی تعلیم کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ ان کی جائیداد ضبط ہوگئی گھر کی مالی حالت خراب ہوگئی۔ اب اکبر کو ان کے والد نے اپنے ایک دوست کے سپرد کر دیا کہ ان کو عدالت کے لیے پروانہ نویسی سکھادیں۔ اکبر کی طبیعت کو اس کام سے فطری مناسبت تھی۔ اس لیے ان کا دل اس میں لگ گیا اور چند دن بعد جب یہ کام انھوں نے سیکھ لیا تو تھوڑا بہت کام بھی ملنے لگا۔

ملازمت

۱۸۵۹ء میں الٰہ آباد کے مجسٹریٹ آر ڈبلیو آئی بنس کی طرف سے اعلان ہوا کہ عدالت میں کچھ جگہیں خالی ہیں، جو لوگ ملازمت چاہتے ہوں اپنا نام امیدواروں میں لکھوائیں۔ "صاحب" انٹرویو لیں گے اور جو انٹرویو میں کامیاب ہوگا اس کو ملازمت مل جائے گی۔

اکبر کسی اچھی نوکری کی تلاش میں تھے اس لیے وہاں پہنچ گئے۔ ان کا نام امیدواروں میں لکھ لیا گیا اور انٹرویو کے لیے انھیں روک لیا گیا وہ بیٹھ کر باہر انتظار کرنے لگے۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئے۔ نہ اب بلایا جاتا ہے نہ تب۔ سب لوگ پریشان تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ "تم

ے سرکاری حکم نامے لکھنا۔

اندر جاکر معلوم کرو کہ کیا دیر ہے۔ یہ اندر جا ہی رہے تھے کہ دیکھا بنسن صاحب باہر آ رہے ہیں۔ یہ گھبرا گئے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ بنسن صاحب نے چپراسی کو دوڑایا اور ان کو بلوا کر ان کا انٹرویو لیا اور ان کو نوکر رکھ لیا۔ اپنے بنگلے میں رہنے کو جگہ دی اور اپنے بیرے اور خانساماں کو خیال رکھنے کو کہا۔ اس طرح اکبر کو انگریزوں کے رہنے سہنے کے ڈھنگ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بنسن صاحب ان کے کام سے بہت خوش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہ اسی طرح محنت اور ہوشیاری سے کام کرتے رہیں تو انھیں بہت جلد تحصیلدار بنا دیا جائے گا، مگر بنسن صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور اکبر بیکار ہو گئے اور انھوں نے پھر ملازمت تلاش کرنی شروع کر دی۔ اس ملازمت کو پانے کے لیے انھیں ایک اور ناگوار واقعہ پیش آیا۔ ایک انگریز افسر کے دفتر کے باہر یہ انٹرویو کا انتظار کر رہے تھے اور جب بہت دیر ہو گئی تو انھوں نے اکتا کر یہ دریافت کرنا چاہا کہ آخر انٹرویو کب ہوگا۔ اس کے جواب میں ان پر کتّا چھوڑ دیا گیا۔ اکبر کو اس حرکت پر بہت غصہ آیا اور یہ وہیں اسی طرح کھڑے رہے۔ انگریز افسر ان کی اس ہمت سے بہت متاثر ہوا اور ان کو فوراً نوکری دے دی۔ مگر اکبر کو نوکری ملنے کی زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ ان کو اس بات کا رنج اور دکھ تھا کہ انگریز ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں اور ہندوستانیوں کو ان ہی کے ملک میں ذلیل کر رہے ہیں۔ انھوں نے سوچنا شروع کیا آخر کیوں انگریز ہم پر مسلّط ہیں؟ اور ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اُبھرنے لگا۔ یہ ملازمت بھی عارضی تھی۔ تھوڑے دن کی بیکاری کے بعد پھر ان کو الٰہ آباد میں جمنا کے پُل کی تعمیر کے سلسلے میں ایک ملازمت مل گئی۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس دوران اکبر برابر پڑھتے رہے۔ رات کو دیر تک جاگ کر پڑھنا ان کی عادت بن گئی تھی۔ وہ شعر و ادب، تصوّف، مذہبی کتابیں، تاریخ و فلسفہ کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے وکالت کے ادنیٰ درجے کا امتحان پاس

لہ قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔

کیا۔ اور الٰہ آباد میں باقاعدہ وکالت شروع کر دی۔ مگر اکبر کے والد کی خواہش تھی کہ یہ وکالت کے بجائے تحصیلداری کریں۔ آخر کو ان کی کوششوں سے الٰہ آباد کے ضلع میں میجا کی تحصیل میں ان کو تحصیلداری مل گئی۔ اکبر یہاں خوش نہیں رہے۔ ایک تو کام پسند کا نہیں تھا۔ پھر دوست احباب، خاندان سب سے دُور تھے۔ یہ اس فکر میں تھے کہ کس طرح سے وہاں سے بھاگیں۔ مگر چونکہ یہ ملازمت بھی عارضی تھی اس لیے ان کو وہاں سے جلدی چھٹکارا مل گیا۔

اکبر جس عدالت میں پہلے ملازم تھے وہاں ایک انگریز جج ٹرول صاحب تھے جو اکبر کی قابلیت، ذہانت اور کارگزاری سے بہت خوش تھے۔ ان کو یہ اندازہ تھا کہ اگرچہ ان کی تعلیم باقاعدہ اسکول اور کالج میں نہیں ہوئی ہے مگر ان کی قابلیت حساب اور انگریزی میں اچھی ہے۔ قانونی معاملوں کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ٹرول صاحب نے چیف جسٹس سے سفارش کر کے انھیں مسل خواں مقرر کرا دیا۔

خاندان کے لوگوں کی یہ رائے نہیں تھی کہ اکبر اس نو عمری میں اتنا بڑا عہدہ سنبھالیں۔ ان کو اس میں شبہ تھا کہ اکبر اتنی بڑی ذمہ داری اُٹھا بھی سکیں گے یا نہیں۔ سب لوگوں نے اکبر کو منع کیا مگر یہ نہیں مانے۔

اکبر نے اسکول میں تھوڑی بہت انگریزی پڑھی تھی، اپنے طور پر کچھ سیکھ لی تھی۔ مسل خوانی کے کام میں اچھی انگریزی جاننے کی ضرورت تھی۔ اکبر نے دن رات محنت کر کے اپنی انگریزی کی قابلیت بڑھائی اور وہ بہت جلد انگریزی میں قانونی نکتوں کو بیان کرنے کے قابل ہو گئے۔ ۱۸۷۳ء میں اکبر نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دیا۔ یہ امتحان بہت مشکل تھا۔ بہت سے امیدواروں میں صرف چار پانچ امیدوار پاس ہوئے تھے۔ ان میں ایک اکبر تھے۔ اس امتحان کو پاس کرنے کے بعد وہ ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ اب بحیثیت وکیل کے اکبر کو لوگ جاننے لگے تھے۔ ان کا شمار اچھے مشہور وکیلوں میں ہونے لگا تھا۔ اب بڑے بڑے وکیل اپنے مقدموں میں انھیں شامل کرنے لگے تھے۔

لہ فائلیں دیکھنے کا کام کرنے والا

دُوسرا باب

شادی

پہلے زمانے میں لوگوں کی شادیاں بہت کم عمری میں کر دی جاتی تھیں۔ یہ دستور تھا کہ کچھ عورتیں جن کو مشاطہ کہا جاتا تھا، گھروں میں جا کر لڑکیوں کو دیکھتیں۔ پھر لڑکے والوں کو اس کی خبر کرتیں کہ فلاں گھر میں لڑکی شادی کے قابل ہے۔ پھر گھر والے اس خاندان کے بارے میں معلومات کرتے اور شادی طے ہو جاتی۔ لڑکے لڑکی کا ایک دوسرے کو دیکھنے کا کیا سوال۔ لڑکیوں کے بڑے ہونے پر ان کا پردہ گھر میں آنے جانے والی عورتوں سے بھی کرا دیا جاتا تھا۔ اس لیے اکبر جب پندرہ برس کے ہو کر سولہویں سال میں داخل ہوئے تو ان کی شادی ایک مشاطہ کے ذریعہ پاس کے گاؤں کے زمیندار خاندان کی ایک لڑکی سے کر دی گئی۔ ان کا نام خدیجہ خاتون تھا۔ مشاطہ نے لڑکی کی بہت تعریف کی تھی۔ خاص طور سے اس کی صورت شکل کی، مگر جب شادی ہوئی تو لوگوں کو خاص طور سے اکبر کو دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ دُلہن کی شکل بہت معمولی ہے۔ اس کے علاوہ اُس کی بول چال دیہاتیوں کی سی تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اکبر بیوی سے کھنچے کھنچے رہنے لگے وہ بے چاری کیا کرتیں۔ نہ تو وہ اپنی شکل وصورت بدل سکتی تھیں نہ اپنا دیہاتی پن دُور کر سکتی تھیں بہر حال کسی نہ کسی طرح گذر ہوتی رہی۔ دو بچے بھی ہوئے۔ اکبر اب باہر گانے بجانے والیوں کے

کوٹھوں پر جاکر اپنا دل بہلاتے، گانا سنتے۔ کیونکہ ان کو موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ بیوی اس پر اور خفا ہوتیں۔ ان کے آپس کے تعلقات بگڑتے رہے اور آخر کو بیوی لڑ جھگڑ کر اپنے میکے چلی گئیں۔ اکبر نے ان کو پھر نہیں بلایا۔ بس بیوی بچوں کا خرچ بھیج دیا کرتے تھے۔ اور پھر ۱۸۷۶ء میں جب وہ ہائی کورٹ میں وکالت کر رہے تھے انھوں نے خاندان والوں کے اصرار اور اپنی خواہش کے مطابق دوسری شادی کر لی۔ دوسری بیوی کا نام فاطمہ صغرا تھا۔ یہ بیوی اکبر کو دل سے پسند آئیں۔ یہ خوبصورت بھی تھیں اور سلیقہ مند بھی۔ اس شادی سے اکبر کی زندگی میں خوش گوار تبدیلی آگئی۔

اولاد

۳۱ دسمبر ۱۸۸۰ء میں ان کے گھر لڑکا پیدا ہوا تو اکبر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اس کا نام عشرت حسین رکھا۔ اس کے بعد ان کے ایک بیٹی ہوئی جو بہت کم عمری میں ختم ہو گئی۔ اور پھر اٹھارہ سال بعد ان کا سب سے چھوٹا بیٹا ہاشم پیدا ہوا۔

اکبر اپنے بڑے بیٹے عشرت حسین کو بہت چاہتے تھے۔ انھیں ان سے بہت توقعات تھیں کہ ان کا یہ بیٹا ان کی تربیت اور اعلیٰ تعلیم پاکر ان کا نام روشن کرے گا۔ چنانچہ انھوں نے بچپن سے ہی عشرت حسین کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی۔ ان کو اپنی ملازمت کے سلسلے میں مختلف جگہوں پر رہنا پڑتا تھا۔ مگر انھوں نے الٰہ آباد میں اپنا گھر بنا لیا تھا جس کا نام انھوں نے اپنے بڑے بیٹے عشرت حسین کے نام پر "عشرت منزل" رکھا تھا اور وہ اپنے بیوی بچوں کو اپنے ساتھ نہ رکھتے تھے، بلکہ ان کا قیام مستقل الٰہ آباد ہی میں رہتا تھا کہ ان کی تعلیم کا نقصان نہ ہو۔ ۱۸۹۰ء میں عشرت حسین نے میٹرک پاس کیا۔ پہلے اکبر نے ان کو کالج کی تعلیم کے لیے آگرہ بھیجا، مگر پھر الٰہ آباد ہی میں میور سینٹرل کالج میں داخل کر دیا۔ یہ ایف اے میں پڑھ رہے تھے۔ ۲۹ مارچ کو ایک نواب خاندان میں ان کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ ان کی برات بریتاب گڈھ گئی اور اکبر کے سبھی دوستوں نے اس میں شرکت کی۔ عشرت حسین ایف اے میں جب

دو بارہ فیل ہو گئے تو اکبر نے ان کو ۱۹۰۰ء میں تعلیم کی غرض سے انگلینڈ بھیج دیا۔ خیال تھا کہ دو تین سال بعد تعلیم حاصل کر کے آجائیں گے تو یہاں کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔ مگر عشرت حسین نے وہاں سات سال لگا دیئے۔ کسی طرح آنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ وہاں یہ ایک انگریز لڑکی سے عشق بھی کرنے لگے تھے۔ یہ خبر بھی اکبر کو مل گئی تھی۔ ان کی پنشن ہو گئی تھی۔ وہ ان کے انگلستان کے قیام کا خرچ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ عشرت جب انگلستان میں تھے تو اس زمانے میں اکبر نے ان کے متعلق ایک نظم اور بہت سے اشعار بھی کہے۔ یہ نظم بہت مشہور ہوئی :

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے

پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی
کیک کو چکھ کے سویوں کا مزا بھول گئے

موم کی پتلیوں پہ ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمھارے دل میں
اور یہ نکتہ، میری اصل ہے کیا بھول گئے

ہند میں میں ہوں، مرا نورِ نظر لندن میں ہے
سینہ پر غم ہے یہاں لختِ جگر لندن میں ہے

عشرت پر جب کسی بات کا اثر نہیں ہوا تو اکبر نے ان کا خرچ بھیجنا بند کر دیا اور آخر کو ۱۹۰۲ء میں عشرت حسین کو مجبور ہو کر ہندوستان آنا پڑا۔

اکبر نے ان کو اپنے اثر سے اچھی ملازمت دلوا دی۔ اکبر کی بیٹی کا تو انتقال ہو گیا تھا۔ عشرت حسین سے ان کو جو توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہوئی تھیں۔ اب انھوں نے اپنی ساری توجہ ہیں اور چھوں اس بی بامیں سنتے ہیں۔

ہاشم پر صرف کرنی شروع کر دی۔ ان کو اپنا یہ چھوٹا بیٹا بہت پیارا تھا اور خیال تھا کہ وہ ان کی امیدوں کو پورا کرے گا۔ وہ ہاشم کی شادی اپنے چہیتے دوست خواجہ حسن نظامی کی بیٹی نور بانو سے کرنا چاہتے تھے، مگر ۵ رجون ۱۹۱۳ء کو ہاشم چند دن کی بیماری کے بعد خدا کو پیارے ہو گئے۔ اکبر کا دل بالکل ٹوٹ گیا۔ انھوں نے ہاشم کی جدائی پر یہ پُر درد اشعار کہے :

جس سے میری زندگی تھی مر گیا۔ کیوں مر گیا
چرخ نے یارب ستم مجھ پر کیا۔ کیوں کر کیا

مایوس ہوں باغِ عالم سے امید سے یاری چھوٹ گئی
جس پیڑ کو سینچا سوکھ گیا، جس شاخ کو باندھا ٹوٹ گئی

شاعری کی ابتدا

اکبر ابھی دس گیارہ سال کے تھے کہ انھوں نے شعر کہنے شروع کر دیے۔ یہ خبر کسی طرح اکبر کے چچا سید وارث علی کو ملی۔ اکبر کو خیال تھا کہ شاید چچا اس شوق کو پسند نہ کریں۔ ایک دن ان کے چچا نے ان کو بلا کر پوچھا۔

"سنا ہے تم شعر کہتے ہو ؟"

اب یہ بڑی مشکل میں تھے کہ کیا کہیں کہ ان کے چچا نے ان کو ایک مصرعہ دیا اور کہا کہ ابھی دوسرا مصرعہ کہہ کر اس شعر کو مکمل کرو۔ مصرعہ یہ تھا۔

بتوں کا عشق ہے عشقِ مجازی بھی حقیقت میں

اکبر نے فوراً اس پر یہ مصرعہ لگا دیا :

یہ مصرعہ چاہیے لکھنا بیاضِ چشمِ وحدت میں

اکبر کے چچا کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ انھیں اندازہ ہوا کہ ان کے بھتیجے کو شاعری کرنے کی

صلاحیت قدرت کی طرف سے ملی ہے۔ انھوں نے کہا جاؤ تمھیں اجازت ہے کہ شاعری کرو۔"

اب اکبر باقاعدہ شاعری کرنے لگے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق انھوں نے شاعری میں استاد وحید کو اپنا استاد بنا لیا یعنی اپنے شعر اُن کے پاس لے جاتے اور وہ ان میں اصلاح کر دیتے تھے۔ استاد وحید الٰہ آباد کے اس وقت کے بڑے شاعر تھے اور اُردو کے مشہور خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔

مشاعرے اکثر ہوتے تھے اور اس میں مصرعۂ طرح[1] دیا جاتا تھا۔ شاعر اس پر غزلیں لکھ کر لاتے اور مشاعرے میں سناتے۔ اب اکبر بھی مشاعروں میں جانے لگے تھے اور اپنے شعر سناتے تو لوگ انھیں پسند کرتے۔ یہ شروع میں غزلیں کہتے تھے اور ان میں وہی باتیں کہتے تھے جو پُرانے شاعر کہتے آئے تھے، یعنی محبوب کی خوبصورتی کا بیان، عشق میں جو تکلیفیں آدمی کو ہوتی ہیں ان کا بیان، خدا کی محبت، دنیا کی بے ثباتی[2] کا ذکر وغیرہ۔ بعض شعر اچھے بھی ہوتے تھے مگر ان کی شاعری میں اس وقت تک وہ بات پیدا نہیں ہوئی تھی جس سے شاعر کو شہرت ملتی ہے اور وہ الگ سے پہچانا جا سکتا ہے۔

[1] بعض مشاعروں کے لیے ایک شعر یا ایک مصرعہ دیا جاتا ہے تاکہ تمام شاعر اس وزن پر غزلیں لکھیں اور پڑھیں۔

[2] ہمیشہ قائم نہ رہنا۔

تیسرا باب

عہدے اور خطاب

اکبر کی قانونی قابلیت کی شہرت ہونے لگی۔ اس وقت کے بڑے بڑے وکیل اور جج جس میں انگریز جج بھی شامل تھے اکبر کی بہت قدر کرتے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں ان کو مرزا پور میں کسی مصنّف کی قائم مقامی کی جگہ ملی اور پھر ہمیر پور میں۔ اس کے بعد دو مہینے کے اندر اندر ہی درجہ دوم کے مصنّف بنا کر ان کو خورجہ بھیج دیا گیا۔ کیونکہ وہاں کی ہائی کورٹ کی حالت بہت خراب تھی۔ اکبر کا تقرر وہاں اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ اس کو درست کریں۔ جب سر سید احمد خاں کو معلوم ہوا کہ اکبر خورجہ میں ہیں تو انھوں نے اور ان کے دوست مولوی سمیع اللہ نے ان کا تبادلہ علی گڈھ کروا لیا اور ۱۸۸۸ء تک علی گڈھ میں رہے۔ سب لوگوں میں اس بات کی شہرت تھی کہ اکبر اپنا کام بہت محنت اور دیانت داری سے کرتے ہیں۔ وہ گھر پر آکر بھی مقدموں سے متعلق کام کیا کرتے تھے۔ رات کو دیر تک جاگنا اور کام کرنا ان کی عادت بن چکا تھا۔ کبھی کوئی مشکل مقدمہ ہوتا تو وہ اس کا فیصلہ لکھنے میں پوری رات جاگ کر کاٹ دیتے تھے۔ وہ اس معاملے میں اس قدر سخت تھے کہ مقدموں کے معاملے میں کسی کی سفارش نہیں مانتے تھے اور صرف ان ہی مقدموں کو لیتے تھے جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ جھوٹے مقدمے نہیں ہیں وہ کہتے

تھے کہ انصاف کرنے والوں کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ان کو ہر قسم کے خوف، لالچ اور رعایت سے دور رہنا چاہیئے۔ وہ اپنے افسروں کا ادب کرتے تھے، مگر ان سے ڈرتے نہیں تھے چاہے وہ انگریز ہی کیوں نہ ہوں۔ اپنے ماتحتوں کا بہت خیال کرتے تھے، ان کی عزت کرتے تھے مگر کام لینے میں کسی قسم کی رعایت نہیں کرتے تھے۔

۱۸۹۲ء میں اکبر کو سشن جج بنا دیا گیا۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جسے یہ عہدہ ملا تھا۔ اس لیے لوگوں نے اس کی بہت خوشیاں منائیں، جلسے ہوئے، ان کو پارٹیاں دی گئیں اور شہر کے بہت سے لوگ ان کو مبارک باد دینے آئے۔ وہ سشن جج کی حیثیت سے یوپی کے مختلف شہروں میں رہے۔ جیسے جون پور، بہرائچ، مین پوری اور سہارن پور۔

۱۸۹۸ء میں ان کی عدالتی خدمات کے صلے میں "خان بہادر" کا خطاب ملا، اور ان کو ہائی کورٹ کا جج بنانے کی تجویز ہوئی۔ مگر اکبر نے شکریے کے ساتھ اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ان کی صحت اچھی نہیں ہے۔ خاص طور سے ان کی آنکھیں بہت کمزور ہو گئی ہیں، اس لیے اُن کو اس میں شبہ ہے کہ وہ اتنے بڑے عہدے پر پہنچ کر جس قدر کام کرنا چاہیئے وہ شاید نہ کر سکیں گے۔ اور پھر ۱۹۰۳ء میں خود وقت سے پہلے پنشن لے لی۔

اکبر کو جو عہدے ملے اور جو خطاب ملا اُس سے اُن کو زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ ان کو اس کا غم تھا کہ ایک غیر قوم نہ صرف ہمارے ملک پر قابض ہے بلکہ وہ ہماری دولت سے خود فائدہ اُٹھا رہی ہے اور ہمیں غریب کر رہی ہے۔ ہماری تہذیب کو ختم کر رہی ہے۔ اس لیے انھوں نے اس موقع پر یہ شعر کہا:

نیشنل[1] وقعت سے گُم ہونے کا ہے اکبر کو غم
آفیشل[2] آنر[3] کا اس کو کچھ مزا ملتا نہیں

---

[4] عزت   [2] سرکاری   [3] ؟   [1] قومی

اپنے جج بننے کا یوں مذاق اڑا دیا ہے

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں

اکبر کے زمانے کے حالات اور اکبر کی شاعری کا نیا موڑ

۱۸۵۷ء کا زمانہ ہندوستان میں عجب بے چینی کا زمانہ تھا۔ اب ہندوستان کی حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ ان کو ایک طرف تو یہ فکر تھی کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ عرصے کے لیے وہ ہندوستان پر حکومت کر سکیں۔ وہ اسی طرح ہو سکتا تھا کہ ہندوستان کی کوئی ترقی نہ ہو، یہاں کی دولت سے وہ خود امیر ہوں، اپنے ملک کو دولت مند بنائیں اور یہاں کے لوگوں کے دل میں یہ بات بٹھا دیں کہ وہ ان کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کی تہذیب، رہنے سہنے کا ڈھنگ، زبان ان کے مذہب کی کمتری ان کے ذہن میں بٹھا کر انگریزی تہذیب و تمدن اور زبان کی برتری کا سکہ ان لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیں، اور ہندوستانی قوم سب کچھ بھول کر انگریزوں کا سایہ بن جائے۔ ان کو جو تعلیم دی جائے وہ بھی ایسی کہ یا تو وہ دفتروں میں صرف بابو بن سکیں، یا پھر ڈپٹی کلکٹر وغیرہ۔

زمانہ بدل رہا ہے اور ہمیں بھی اس کے ساتھ بدلنا چاہیئے۔ یہ بات ہندوستانیوں نے، خاص طور سے ان لوگوں نے جو دل سے اپنے ملک کی ترقی و بھلائی چاہتے تھے، سوچنا شروع کر دی تھی۔

اس لیے ہندوستان میں کچھ ایسے مصلح[1] پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی قوم کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ ان لوگوں نے یہ بتایا کہ انگریزوں سے نفرت کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں بھی اگر ان کی طرح ترقی یافتہ بننا ہے تو نئے زمانے کے طور طریقوں کو اپنانا چاہیئے اور مغربی علوم حاصل

---

[1] اصلاح کرنے والے۔

کرنا چاہیے۔ نئے زمانے میں اب ہم کیسے رہیں یہ جاننا چاہیے۔ اگر ہم پرانی لکیر پر چلتے رہیں تو ہم ترقی کی دوڑ میں ان قوموں سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اس طرح کے لوگوں میں راجہ رام موہن رائے اور سر سید احمد خاں (جو عام طور پر سر سید کے نام سے جانے جاتے ہیں) بہت مشہور ہیں۔

ہندوستانی ہندوؤں کے مقابلے میں ہندوستانی مسلمان انگریزوں کی تہذیب ان کی تعلیم اور ان کے طور طریقوں سے زیادہ نفرت کرتے تھے۔ وہ انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانا بھی مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کی ہر بات کو برا سمجھتے تھے اور نئے زمانے کی آمد کا ان کو احساس بھی نہیں تھا۔ سر سید نے اس کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے دل سے انگریز قوم کی نفرت کو دور کریں۔ اس قوم میں جو خوبیاں ہیں ان کو بڑھا چڑھا کر لوگوں کے سامنے پیش کریں، اور یہ بتائیں کہ ان ہی کی بدولت یہ قوم آج ہم پر حکومت کر رہی ہے اور ترقی یافتہ قوم کہلاتی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم حاصل کرنے پر اکسایا اور ان کو نئی تہذیب و تمدن اختیار کرنے کی ہدایت دی۔ انھوں نے اپنے کچھ ہندوستانی اور انگریز دوستوں کے ساتھ مل کر علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کھولا جو بعد میں یونیورسٹی بنا اور اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ سر سید کا مقصد یہ تھا کہ اس میں ہندوستانی مسلمان خاص طور پر آکر تعلیم حاصل کریں۔ مسلمانوں کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا اور نئے طور طریقے اپنانا ہمارے مذہب اسلام کے خلاف ہے۔ سر سید نے ان کے دل سے یہ بات بھی نکالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مختلف قسم کی سوسائٹیاں قائم کیں۔ رسالے نکالے، ان میں خود مضامین لکھے اور اپنے ہم خیال ساتھیوں سے لکھوائے، اور ان کے ذریعے اپنی قوم کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ سر سید نے یہ بھی کہا کہ ہمارے ادب میں بھی اصلاح ہونی چاہیے۔ ہمارے ادب میں صرف عشق و عاشقی کے قصے، پریوں اور جنوں کی کہانیاں نہیں ہونی چاہئیں بلکہ مغربی ادب کو پڑھ کر اپنے ادب

میں بھی اچھی تبدیلیاں کرنا چاہئیں اس معاملے میں سرسید کی سب سے زیادہ مددان کے دوست خواجہ الطاف حسین حالی نے کی۔

ان سب حالات سے اکبر بھی متاثر ہوئے اور سوچنے لگے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا کیا فرض ہے؟ کیا وہ خاموشی سے بیٹھ کر اپنی پرانی طرح کی شاعری کرتے رہیں اور ملک کے حالات سے منھ موڑ لیں، یا پھر اپنی شاعری کا رُخ پھیر کر اسے لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بنائیں۔ اکبر ملک کے حالات سے بہت بیزار تھے۔ ان کو پرانی طرح کی شاعری کر کے سکون محسوس نہیں ہوتا تھا۔ سرسید کی تحریک سے متاثر ہو کر جو شاعری ہو رہی تھی اکبر اس کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اخبار "اودھ پنچ" نام سے نکلا۔ اس اخبار میں انگریزوں کی حکومت، ان کی تہذیب اور اس کے ساتھ ان ہندوستانیوں کا مذاق اڑایا گیا تھا جو آنکھ بند کر کے بس انگریزوں کی نقل میں لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بھی ہنسی اڑائی گئی تھی جو پرانی لکیر کے فقیر بنے ہوئے تھے۔ پرانی رسموں اور رواجوں سے بُری طرح چپٹے ہوئے تھے۔ اس اخبار کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے ظلم، سماجی برائیوں اور انگریزی تہذیب کی نقل کرنے والوں کا مذاق اُڑایا جائے کہ انھیں اس کے بھدّے پن کا احساس ہو جائے۔ یہ اخبار اکبر کی نظر سے گزرا تو انھیں اپنا راستہ نظر آ گیا۔ انھوں نے سوچا کہ وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار ہنسی کے پیرائے میں کریں۔

بات کہنے کے بہت سے انداز، بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔ جو بات ہنسی مذاق کے انداز میں کہی جائے، اس طرح کہ لوگ اس سے نہ خفا ہوں نہ ان کو دُکھ پہنچے، بلکہ وہ اس پر خود بھی ہنسیں اور جو بات کہی گئی ہے اس کے بارے میں سوچیں۔ اس کو طنز و ظرافت کہتے ہیں۔ ظرافت کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ بات کو اس طرح کہا جائے کہ لوگ اس کے اس بھدے اور بے تکے پن کو محسوس کر سکیں، جس کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے اور اس سے محظوظ بھی ہوں۔ طنز میں ہنسی کے ساتھ ایک دُکھ کی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ وہ دُکھ جو طنز کرنے والے کو

کسی غلط بات کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اچھا طنز وہ ہوتا ہے جس پر انسان ہنسے بھی اور اس کے دل میں ایک ہلکی چبھن بھی ہو۔

اکبر نے طنزیہ مزاحیہ انداز میں شاعری "اودھ پنچ" سے شروع کی۔ وہ اس میں سماج، حکومت اور معاشرے کی دوسری برائیوں کو لے کر شعر کہتے، مضامین لکھتے۔ ان کی مزاحیہ و طنزیہ شاعری سب نے بہت پسند کی اور جلد ہی وہ مشہور ہو گئے۔

اکبر اور سرسید احمد خاں

اکبر کو سرسید احمد خاں سے بعض معاملات میں اختلاف تھا۔ اکبر کہتے تھے کہ ہمیں ترقی کرنا چاہیئے۔ زمانے کے ساتھ بدلنا چاہیئے۔ نئے علوم حاصل کرنا چاہیئے۔ مغربی تہذیب کی اچھی باتوں کو بھی قبول کرنا چاہیئے مگر اس طرح کہ بنیادی طور پر ہم اپنی تہذیب، اپنے مذہب اور اپنے ملک سے رشتہ قائم رکھیں۔ ہماری یہ شناخت باقی رہنا چاہیئے کہ ہم ہندوستانی ہیں۔ اکبر کے دل میں انگریزوں کی سیاست، ان کی تہذیب اور اس تعلیم سے سخت نفرت بیٹھی ہوئی تھی جو وہ ہندوستانیوں کو دے رہے تھے۔ اکبر انگریزوں کے ان مظالم پر کڑھتے جو انگریز ہندوستانیوں پر کر رہے تھے۔ وہ ان ہندوستانیوں کو بھی پسند نہیں کرتے تھے جو اندھا دھند انگریزوں سے مرعوب ہو کر ان کی نقل کر رہے تھے۔

اکبر کا یہ خیال تھا کہ سرسید جو مسلمانوں کی ترقی کی تحریک چلا رہے ہیں اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہندوستانی، خاص طور سے ہندوستانی نوجوان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہماری بھلائی اور بڑائی اسی میں ہے کہ ہم "صاحب" لوگوں کی نقل کریں۔ ان کی طرح باتیں کریں، ان کی طرح بنگلوں میں رہیں، ان کی طرح کوٹ پتلون پہنیں، ان کے قائم کیے ہوئے اسکولوں میں جائیں اور وہ تعلیم حاصل کریں جس میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ انگریز ہم سے ہر طرح بہتر ہیں اور ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم ان کے وفادار رہیں۔ اکبر کو یہ بدگمانی بھی تھی کہ یہ سب سرسید انگریزوں

کی خوشامد میں ان سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کر رہے ہیں۔ اس لیے اکبر نے سرسید کی تحریک اور ان کے کالج کا خوب مذاق اُڑایا

مریدِ دہر ہوئے، وضعِ مغربی کرلی
نئے جنم کی تمنّا میں خود کشی کرلی

ولادے ہم کو بھی صاحب سے لائلٹی[1] کا پروانہ
رہے لاکھوں برس سید تیرے آنر کا افسانہ

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی قائم رکھا
رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

سید کو فلک نے تننے نہ دیا
تہذیب کو دوبارہ جننے نہ دیا
ملّت کی شکست میں مدد دی کامل
بننے لگی قوم تو بننے نہ دیا

عام طور پر یہ مشہور ہو گیا کہ اکبر الٰہ آبادی سرسید احمد خاں کے مخالف ہیں۔ اس لیے وہ لوگ جو سرسید کی تحریک کے حامی تھے۔ اکبر کو پرانے خیال کا سمجھنے لگے، مگر سرسید اس قدر دُھن کے پکّے تھے کہ انھوں نے ان باتوں کا کوئی اثر نہ لیا۔ لوگ اِس سے بڑھ کر ان کو بُرا بھلا کہتے مگر وہ کسی کی پرواہ نہ کرتے۔ اکبر کی وہ بہت عزت کرتے تھے۔ اِسی لیے جب اکبر خورجہ میں تھے تو انھوں نے کوشش کر کے اکبر کا تبادلہ علی گڈھ کرایا۔ اسی زمانے میں علی گڈھ کالج

[1] وفاداری

کو اکبر نے قریب سے دیکھا۔ سر سید سے ملاقاتیں ہوئیں۔ سر سید کے اور دوسرے ساتھیوں سے بحث و مباحثے ہوتے اور اس زمانے میں اکبر کے خیالات میں تبدیلی آئی۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہوا کہ سر سید جو بھی کر رہے ہیں اس میں ان کا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔ ان کے دل میں قوم کا درد ہے اور وہ سچے دل سے قوم کی بھلائی چاہتے ہیں اگر ان کی تحریک کا غلط اثر ہو رہا ہے تو اس میں سر سید کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا حالات کا۔ سر سید کے دل میں اپنی قوم کو ترقی کی راہ پر لگا لے کا اس قدر جوش ہے کہ وہ اس جوش میں اپنی قوم کے سامنے انگریزوں اور ان کی تہذیب کی تعریف اس طرح کر جاتے ہیں کہ اس کا غلط اثر ہوتا ہے مگر سر سید کی نیت بُری نہیں ہے اور اس طرح سے اکبر کے دل میں سر سید کی طرف سے جو بدگمانیاں تھیں وہ دُور ہو گئیں۔ اب اکبر اپنے شعروں میں سر سید کا مذاق اُڑاتے، ان کے کالج پر طنز کرتے مگر اب ان کا انداز بدل گیا تھا۔ اب وہ ان چیزوں کا مذاق اُڑاتے جو واقعی بھونڈی اور بھدی تھیں۔ سر سید کی زندگی میں اکبر نے اپنے شعروں میں سر سید کے کاموں کو سراہا اور مرنے کے بعد بھی ان کی تعریف کی۔

بعد سید کے مَیں کالج کا کروں کیا درشن
اب محبت نہ رہی اس بتِ بے پیر کے ساتھ

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے، کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی مَیں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

چوتھا باب

اکبر کی شاعری

نئی تعلیم اور تہذیب کے اثر سے لوگوں کے دل سے مذہب کی محبت اور ان کی زندگی سے مذہب کی اہمیت اٹھتی جاتی تھی۔ اکبر کو اس کا بہت قلق تھا۔ نئے تعلیم یافتہ لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ مذہب کو ماننا قدامت پرستی ہے۔ اکبر نے ایک طرف تو اس معاشرے کی اس حالت کو اپنے شعروں میں پیش کیا کبھی مزاحیہ انداز میں، کبھی طنزیہ طور پر جیسے ؂

نام اللہ و رسول اب تو مَیں کم سنتا ہوں
پہلے رائج تھے یہ الفاظ مسلمانوں میں

تاکید عبادت پہ اب یہ کہتے ہیں لڑکے
پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں
جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

اکبر کا کہنا تھا کہ انسان کو اچھی زندگی گزارنے کے لیے کسی نہ کسی مذہب کو ماننا ضروری ہے۔ ہر مذہب اچھا ہے اور وہ اچھی باتوں کی تعلیم دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں اور شعروں میں مذہب کی اہمیت پر زور دیا ہے اور لوگوں کے مذہب سے بیگانہ ہو جانے پر افسوس کیا ہے۔

کہاں کے ہندو کہاں کے مسلم بھلائی سب نے ہیں اگلی رسمیں
عقیدے سب کے ہیں تین تیرہ، نہ گیارھویں ہے نہ اشٹمی ہے

اب سبحہ[1] و زنار[2] اٹھا جاتا ہے
خیر ہندو کی ہے اب نہ مسلمان کی خیر

اکبر نے اپنی شاعری میں ان لوگوں کا بھی مذاق اڑایا ہے جو انگریزوں کی اندھی نقل کرنے میں لگے ہوئے تھے انھوں نے یہ بتایا کہ کسی قوم و تہذیب کی اچھی باتیں سیکھنا بُرا نہیں ہے۔ مگر اپنے طور طریقوں کو بھول کر بس دوسروں کی نقل کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہماری تہذیب بہت پرانی ہے۔ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں ہمیں اسے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ مثلاً ان شعروں میں اکبر نے ان ہندوستانیوں کا مذاق اڑایا ہے جو انگریزوں کی نقل میں اپنا رہن سہن، اپنی بول چال بھول گئے ہیں ؎

لنڈن میں ہو کے ہنڈ میں جب آنے مانگتا
گاڑی میں جورو لوگ کو بٹھلانا مانگتا

مٹ بولو ایسی بات کہ ہم دیسی لوگ ہیں
"صاحب" کا نام ڈِل کو بہت بھانے مانگتا

---

[1] تسبیح [2] جنیؤ

اکبر نے صاف کہہ دیا کیا خوب یہ غزل
جو لیڈی لوگ باجے پہ ہے گانے مانگتا

بہت شوق انگریز بننے کا ہے
تو چہرے پہ اپنے گلٹ کیجئے

کیا کہوں اس کو میں بدبختیٔ نیشن[1] کے سوا
اس کو آتا نہیں اب کچھ امیٹیشن[2] کے سوا

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردّی
بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

اکبر کا کہنا تھا کہ ؎

حاصل کرو علم کو، طبع کو تیز کرو
باتیں بری جو ہیں اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکوں میں اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

ہوش میں رہ کے کرو دُور نقائص اپنے
مغربی لوگ تو مست اپنے کمالات میں ہیں

---

[1] قوم [2] نقل

بخدا ہند کے پرزے بھی غضب ڈھلتے ہیں
یہ غلط ہے کہ ولایت ہی کا مال اچھا ہے

اکبر نے اپنی شاعری میں انگریزوں کی تہذیب، ان کی سیاست اور ان کی چالوں کا بھی خوب مذاق اُڑایا جو وہ ہندوستانیوں کے ساتھ چل رہے تھے۔ ان کے ظلم و جبر پر طنز کیا۔ جیسے ؎

انجن آیا نکل گیا زن سے
سن لیا نام آگ پانی کا
علم پورا ہمیں سکھائیں اگر
تب کریں شکر مہربانی کا

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی میں جلسۂ تقسیم اسناد ہوا تو اس میں اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ کرزن نے اپنی تقریر میں کہا کہ "ہندوستانی قوم بہت جھوٹ بولتی ہے۔" ان کی اس بات پر ہندوستانی اخباروں نے احتجاج کیا اور کافی دنوں اس پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ اکبر نے اس موقع پر یہ اشعار کہے ؎

بے ڈھب یہ جھوٹ سچ کی چھڑی بحث ہند میں
سچ کہتے ہیں جو جھوٹ کہیں ہم تو روسیاہ
جھوٹے سہی پر آپ تو ہم پر ہیں حکمراں
جھوٹے ہیں ہم تو آپ ہیں "جھوٹوں کے بادشاہ"

اور ان شعروں میں وہ انگریزوں کی حکومت پر یوں طنز کرتے ہیں ؎

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشین برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا
بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا
دل دربار میں اٹکا دیکھا

اوج برٹش راج کا دیکھا
پرتو تخت و تاج کا دیکھا
الگ زمانہ آج کا دیکھا
رُخ کرزن مہاراج کا دیکھا

اکبر ایک جلسے میں یہ نظم پڑھ رہے تھے۔ اس وقت اس جلسے میں بہت مشہور لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ بھی تھے، جب اکبر نے یہ شعر پڑھا۔

محفل اُن کی، ساقی اُن کا
آنکھیں میری، باقی اُن کا

تو پنڈت مدن موہن مالویہ کھڑے ہو گئے اور اکبر کو گلے لگا کر بولے "اکبر صاحب ہم سیاسی لیڈر برسوں سے جو بات اپنی تقریروں میں کہنا چاہ رہے ہیں وہ آپنے اس ایک شعر میں کہہ دی۔"

اکبر جب حکومت کے خلاف اس قسم کے شعر لکھتے تو حکومت کی طرف سے ان کو دھمکی دی جاتی کہ وہ اگر اس طرح کے شعر کہیں گے تو جو پنشن ان کو ملتی ہے وہ بند کر دی جائے گی، وغیرہ وغیرہ۔ اکبر اس قسم کی دھمکیوں سے ڈرتے تھے، کیونکہ وہ لیڈر تو تھے نہیں بلکہ شاعر تھے اور وہ اپنے خیالات کا اظہار شاعری کے ذریعے ہی کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس شعر میں انگریزوں پر کیا خوب طنز کیا ہے:

لے عکس۔ جلوہ ؎

جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبل کی
جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے
طرح طرح کے بنالو لباس رنگا رنگ
علاوہ رُوئی کے ریشم بھی اور وُول بھی ہے
جب اتنی نعمتیں موجود ہیں اگر اکبر
تو حرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے

۱۹۱۱ء میں دہلی میں جب اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ کرزن کا دربار ہوا اکبر نے ایک نظم "جلوۂ دربارِ دہلی" کے عنوان سے کہی۔ یہ اُن کی بہت مشہور نظم ہے۔

سر میں شوق کا سودا دیکھا
دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا
جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا
حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا[1]

پلٹن اور رسالے دیکھے
گورے دیکھے، کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے
بینڈ بجانے والے دیکھے

---

[1] انگلستان کے ولی عہد بھی اس تقریب میں موجود تھے۔

۵ سینے ادھر ایسے کہ سہیں توپ و رفل بھی
کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

اکبر کو اس بات کا بہت غم تھا کہ ہندوستانی، خاص طور سے ہندوستانی مسلمان تعلیم و ترقی کی راہ سے بہت دُور تھے. وہ بے عملی اور کاہلی کی زندگی گزار رہے تھے. محنت سے دُور بھاگتے تھے. اکبر نے اس وقت کے مسلمانوں کی اس حالت کو ایک لطیفے کی صورت میں یوں بیان کیا ہے:

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس
سناؤں آپ کو فرضی لطیفہ
کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس[1]
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا کرلے تو گر ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کجا[2] عاشق کجا کالج کی بکواس
بڑی بی آپ کو کیا ہوگیا ہے
ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس
اگر یہ شرط ٹھہری وصلِ لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا باحسرت و یاس

---

[1] لکھا ہے۔ [2] کہاں

اکبر نے بار بار اپنی شاعری میں اس بات پر زور دیا کہ ہندوستانیوں کو اتحاد سے رہنا چاہیئے۔ چاہے ہمارے مذہب مختلف ہیں، ہماری زبانیں الگ ہیں، ہمارا رہن سہن الگ ہے مگر ہم ہندوستانی ہیں اور ایک قوم ہیں ؎

تم ہلو یا نہ ہلو مجھ سے، مَنو یا نہ مَنو
ساتھ رہنا ہے اسی ملک میں اے ہم وطنو

کہتا ہوں میں ہندو مسلمان سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر تو پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

نئی تہذیب کا چلن ہوا تو اس میں عورتوں کی تعلیم اور ان کی آزادی کا بھی چرچا ہوا۔ اکبر کو یہ بات پسند نہیں آئی اور انھوں نے سوچا کہ یہ انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہندوستانی عورتیں بھی پردہ چھوڑ دیں گی، کالجوں میں پڑھیں گی اور بے حیا ہو جائیں گی تو انھوں نے اس بات کا بہت مذاق اڑایا اور اس کے پردے میں لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ بات ہماری قوم کے لیے نقصان دہ ہے ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبرؔ زمیں پہ غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اس نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

ان سے بیوی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

مگر رفتہ رفتہ اکبر کو یہ احساس ہوا کہ عورتوں کی حالت بھی بدلنی چاہیے۔ ان کو تعلیم پانا چاہیے اور عورتوں کی آزادی بُری نہیں ہے' اگر وہ ایک حد کے اندر ہو اور اس کا مقصد انگریزوں کی نقل نہ ہو۔ اس لیے وہ آخر زمانے میں یہ کہنے لگے تھے۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے، مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پَری نہ ہوں

اس کے علاوہ اکبر نے اپنی نظموں میں کہیں مزاحیہ طور پر' کہیں سنجیدہ طور پر اچھے اخلاق' وطن دوستی' بے تعصبی اور اپنے ملک اپنی تہذیب اپنے مذہب سے محبت کا پیغام دیا۔

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعالِ[1] مُضر[2] سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبرؔ نے سنا ہے اہلِ غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

ایک نظم میں اکبر نے اچھے بیٹے کی خصوصیات بتائی ہیں ؎

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے
ہے زندگی کا لطف تو دل کا سرور ہے

---

[1] کام۔
[2] نقصان دہ۔

خوش قسمتی کی اس کو نشانی سمجھتے ہیں

کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے

اکبؔر بھی اِس خیال سے رکھتا ہے اتفاق

اس کا بھی ہے یہ قول کہ ایسا ضرور ہے

البتہ شرط یہ ہے کہ بیٹا ہو ہونہار

مائل ہے نیکیوں پہ بُرائی سے دُور ہے

سنتا ہے دل لگا کے بزرگوں کے پندؔ[1] کو

وقتِ کلام لب پہ جناب و حضور ہے

انکارِ والدین میں دل سے ہے وہ شریک

ہمدرد ہے، معین ہے، اہلِ شعور ہے

رکھتا ہے خاندان کی عزت کا وہ خیال

نیکوں کا دوست صحبتِ بد سے نفور ہے

کسبِ کمال کی ہے شب و روز اس کو دُھن

علم و ہُنر کے شوق کا دل میں وفور ہے

لیکن جو اِن صفات کا مطلق نہیں پتہ

اور پھر بھی یہ خوشی تو خوشی کا قصور ہے

نئے زمانے کے اثرات سے ادب میں جو اچھی تبدیلیاں آ رہی تھیں اکبر نے ان کا اثر قبول کیا تھا۔ انھوں نے انگریزی نظم بینک ورس کے طرز پر بلا قافیہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی یہ نظم بھی بہت خوب ہے۔ اس میں انھوں نے ایک بوڑھے اور لڑکوں کی بات چیت دکھائی ہے :-

---

[1] نصیحت

ایک بوڑھا نحیف و خستہ زار
اک ضرورت سے جاتا تھا بازار
ضعفِ پیری سے خم ہوئی تھی کمر
اور بے چارہ چلتا تھا رک کر
چند لڑکوں کو اس پر آئی ہنسی
قد پر پھبتی کمان کی سوجھی
کہا اک لڑکے نے اس سے کہ بول
تو نے کتنے کو لی، کمان یہ مول
وہ مردِ لطیف و دانش مند
ہنس کے کہنے لگا کہ اے فرزند
پہنچو گے میری عمر کو تم جس دن
مفت مل جائے گی تمھیں یہ کمان

اکبر کی نظم "دریا کی روانی" بھی بہت مشہور ہے جو انھوں نے انگریزی کے مشہور شاعر "سدے" کی نظم WATER COMES DOWN کو سامنے رکھ کر لکھی ہے۔ اس نظم کو پڑھو تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم دریا کے کنارے کھڑے خود اپنی آنکھوں سے دریا کی روانی کا منظر دیکھ رہے ہیں :

اُچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا
اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
یہ بنتا ہوا اور تنتا ہوا
پٹکتا ہوا اور چھینتا ہوا

روانی میں اک شور کرتا ہوا
رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں کے روزن زمیں کے مسام[1]
یہ ہے کررہا ہر طرف اپنا کام
اِدھر پھولتا ہے اور پچکتا اُدھر
وُرخ اِس سمت کرتا کھسکتا اُدھر
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا
چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا
یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا
یہ لہروں پہ پیہم نچاتا ہوا
وہ کھیتوں میں راہیں کتراتا ہوا
زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یونہی الغرض یہ پانی چلا
بس اب دیکھ لیں شاعرِ نکتہ داں
وہ سودے کا سیلان آبِ لوڈر
یہ بحرِ خیالات اکبرؔ کا زور

نئے زمانے کے ساتھ بہت سی نئی چیزیں سامنے آئیں۔ ان ہی میں ڈارون کی ارتقائے[2] انسانی

---

[1] چھوٹے چھوٹے سوراخ جو انسان کے جسم میں بے شمار ہوتے ہیں۔

[2] قدیم انسان کی پیدائش، شکل وصورت سے لے کر آج کے انسان تک کا سلسلہ۔

کی تھیوری بھی ہے، جس کی رُو سے انسان بندر کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اکبرؔ نے اپنے اشعار میں اس خیال کا بہت مذاق اُڑایا ہے ؎

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دُور تھے
میں نہ مانوں گا کہ مورث[1] آپ کے لنگور تھے

ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے
یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں

[1] باپ دادا

پانچواں باب

پنشن اور آنکھ کا آپریشن

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ اکبرؔ کی صحت بہت خراب تھی۔ خاص طور پر دن رات کی پڑھائی لکھائی کی وجہ سے ان کی آنکھیں خراب ہوگئی تھیں۔ اس لیے انھوں نے ۱۹۰۳ء میں قبل از وقت پنشن لے لی اور ۱۹۰۹ء میں کلکتہ جاکر اپنی آنکھ کا آپریشن اُس وقت کے مشہور آنکھوں کے سرجن ڈاکٹر مینارڈ سے کرایا۔ آپریشن کے بعد انھوں نے یہ دلچسپ شعر کہا ؎

روشنی آئے تو ہم دیکھیں ذرا اپنا حساب
لے گئے دو سو تو وہ آنکھوں پہ پٹی باندھ کر

اکبرؔ کے دوست اور مُلاقاتی

اکبر اپنی شاعری، اپنی شخصیت اور اپنی دلچسپ باتوں کی وجہ سے لوگوں میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔ لوگ ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ یہ لوگوں کے کام بھی بہت آتے تھے۔ الٰہ آباد میں جو بھی بڑے آدمی آتے اکبر سے ملنے ضرور آتے۔ ایک دن اکبر اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھے تھے، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مجمع چلا آرہا ہے اور شور ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ مشہور لیڈران مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی چلے آرہے ہیں

جو علی برادران کے نام سے مشہور تھے۔ اکبر سے مل کر دیر تک گفتگو کی اور وہ چلے گئے۔ اکبر ان دونوں بھائیوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ ان کے لیے یہ شعر بھی کہا تھا۔

دشوار ہے مستحقِ آنر[1] ہونا
کچھ سہل نہیں علی برادر ہونا

مولانا شوکت کی بہت بڑی داڑھی تھی اور کانگریس میں شامل تھے۔ انگریزوں کے خلاف تھے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کی بھی داڑھی تھی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر تھے مگر انگریزوں اور ان کی پالیسیوں کے حامی تھے۔ اکبر نے ان دونوں کے لیے یہ شعر کہا جو بہت دل چسپ ہے ؎

ایک شوکت اور ضیاء الدین وضع و خو[1] میں ہیں
فرق اتنا ہے کہ وہ جنگل میں ہیں یہ زو[2] میں ہیں

سروجنی نائیڈو الٰہ آباد آئیں تو انھوں نے اکبر کو ایک پرچہ بھیجا کہ میں الٰہ آباد آئی ہوئی ہوں اور چاہتی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ آپ ہندوستان کے بہت بڑے طنز نگار اور شاعر ہیں، اگر میں الٰہ آباد آکر آپ سے بغیر ملے چلی گئی تو میرا یہاں آنا بیکار رہے گا۔ اکبر نے ان کو وقت دیا تو وہ پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ آئیں اور کافی دیر اکبر کے پاس بیٹھیں اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

پنڈت ہرکشن پرشاد کول سے بھی اکبر کی بہت دوستی تھی اور خط و کتابت تھی جن سے اکبر تصوف کے مسائل اور شاعری کے موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ اسی طرح اس وقت کے مشہور شاعر عزیز لکھنوی سے بھی اکبر کی خط و کتابت تھی اور ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ اکبر اپنے ذاتی دکھ اور پریشانیاں بھی ان کو لکھتے تھے اور مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال بھی کرتے تھے۔ ایک دفعہ اکبر نے انھیں اپنے گھر کھانے پر بلایا تو یہ شعر شبلی کو لکھ کر بھیجے ،

---

[1] عادت [2] چڑیا گھر

آتا نہیں مجھکو قبلہ تبلی
بس بات یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات
کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات

شبلی نے اس خط کا جواب شعروں ہی میں دیا جو بہت دل چسپ ہے :-

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف و کرم سے مجھے انکار نہیں
حلقۂ[1] در گوش ہوں، ممنون ہوں مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور[2] ہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی
جیتے جی مُردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

اکبر کو غالب کی طرح آم بہت پسند تھے چنانچہ اپنے ایک دوست سے آم بھیجنے کی فرمائش نظم میں یوں کرتے ہیں :

نامہ کوئی نہ یار کا پیغام بھیجیے
اس فصل میں جو بھیجیے بس آم بھیجیے
ایسے ضرور ہوں کہ انھیں رکھ کے کھا سکوں
پختہ[3] اگر ہوں بیس تو دس خام[4] بھیجیے

---

[1] غلام [2] بادشاہ جو لنگڑا تھا۔ شبلی کی ٹانگیں ایک حادثے میں زخمی ہو گئی تھیں۔
[3] کچے [4] پکے۔

معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈریس

سید ہے الہ آباد مرے نام بھیجئے

ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں

تعمیلِ حکم ہوگی مگر دام بھیجئے

ڈاکٹر اقبال اکبر سے بہت متاثر تھے، ان کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کو اپنا استاد کہتے تھے۔ وہ دو مرتبہ خاص طور سے الہ آباد اکبر سے ملنے آئے اور تیسری مرتبہ آنا چاہتے تھے مگر اکبر کا انتقال ہوگیا۔ شروع میں اکبر سے متاثر ہو کر انھوں نے اکبر کی طرح طنزیہ اور مزاحیہ شاعری بھی کی تھی۔ ان کے یہ شعر بالکل اکبر کے رنگ کے معلوم ہوتے ہیں۔

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ

دفع[1] مرض کے واسطے پِل[2] پیش کیجئے

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض

دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق

کہتا ہے ماسٹر سے کہ بِل پیش کیجئے

مگر اقبال اس طرز پر زیادہ دنوں چل نہیں سکے اور انھوں نے اس طرح کی شاعری چھوڑ دی اکبر بھی اقبال کو چاہتے تھے اور ان کی شاعری کو بھی پسند کرتے تھے اور ان کا یہ خیال تھا جو بہت حد تک درست بھی تھا کہ اقبال بہت حد تک ان کے ہم خیال ہیں۔ اور بہت سے معاملوں میں وہ اکبر کے ہم رائے ہیں۔ اکبر کے انتقال پر اقبال نے فارسی میں ایک قطعہ بھی کہا تھا اور ان کو بہت اچھے الفاظ میں یاد کیا تھا۔

مولانا عبدالماجد اور خواجہ حسن نظامی اکبر کے بہت چہیتے دوست تھے۔ دونوں

---

[1] دور کرنا [2] گولی

خاص طور سے عبدالماجد دریابادی اِن سے بہت چھوٹے تھے، مگر ان کو اپنے دوستوں کی صف میں رکھتے تھے۔

عبدالماجد نے مغربی تعلیم حاصل کی تھی، فلسفہ پڑھا تھا اور اس کے اثر سے وہ اپنے ابتدائی زمانے میں مذہب سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ اکبر مولانا عبدالماجد کی ذہانت اور قابلیت سے متاثر تھے اور ان کو اس کا رنج تھا کہ وہ مذہب سے بیگانہ ہیں۔ اکبر جب ان سے ملتے اور خطوں میں بھی ان کو مذہب کا مطالعہ کرنے کی ہدایت کرتے۔ کہتے قرآن کا مطالعہ کرو۔ اکبر کا کہنا تھا کہ جب تک ہم مذہب کا گہرا مطالعہ نہ کریں اس سے پوری واقفیت حاصل نہ کریں اس سے انکار کرنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے۔ دھیرے دھیرے عمر، تجربے، مذہب کے مطالعہ اور اکبر کی نصیحت نے کام کیا اور مولانا عبدالماجد کی مذہب سے بیگانگی دور ہو گئی۔

خواجہ حسن نظامی سے اکبر کے بالکل بھائیوں کے سے تعلقات تھے۔ وہ اپنے ذاتی معاملوں میں خواجہ صاحب سے صلاح لیا کرتے تھے۔ اکثر دہلی آکر کافی دنوں ان کے پاس رہتے تھے۔ خواجہ صاحب کے گھر کی خواتین یعنی ان کی ساس اور بیوی اکبر سے پردہ نہیں کرتی تھیں اور ان کے گھر میں اکبر کی حیثیت ایک پیارے اور محترم بزرگ کی سی تھی۔ خواجہ صاحب کی بیٹی نور بانو (جن کا انتقال کم عمری میں ہو گیا تھا) کو اکبر بہت چاہتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت میں دل چسپی لیتے تھے اور جیسا کہ ذکر آچکا ہے ان کی شادی اپنے بیٹے ہاشم سے کرنا چاہتے تھے۔

خواجہ حسن جو کتابیں اور مضامین لکھتے اکبر ان کو بہت پسند کرتے۔ خواجہ حسن نظامی صوفی تھے اور صوفی لوگ ہر مذہب کی مذہبی ہستیوں کا ادب و احترام کرتے ہیں۔ ان کو مقدس مانتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاہے راستے مختلف ہوں مگر ہر راستہ خدائے حقیقی کی طرف لے جاتا ہے اور اصل مذہب یہ ہے کہ خدا سے محبت کی جائے۔ اس کے بندوں کو چاہا جائے۔ چنانچہ خواجہ حسن نظامی نے سری کرشن کے بارے میں کتاب "کرشن بیتی" لکھی جو بہت مشہور ہوئی۔ اکبر کو بھی وہ کتاب بہت پسند آئی۔ انھوں نے خواجہ صاحب کی اس کتاب کی تعریف کے ساتھ

لکھا کہ یہ ضروری ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں جانیں۔ کیونکہ اس طرح ہم ایک دوسرے کے قریب آئیں گے اور اس سے ہمارے درمیان میل اور محبت بڑھے گا جس کی تعلیم ہر مذہب دیتا ہے۔ اس لیے بھی یہ ضروری ہے کہ یہ وقت اختلاف کا نہیں اتحاد کا ہے۔

اکبر نے جب اپنی جائیداد کی تقسیم کی تو خواجہ حسن نظامی کو دہلی سے بلا کر انھیں اس کا گواہ بنایا۔ انھوں نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ مرنے کے بعد ان کو دہلی میں دفن کیا جائے۔ مگر افسوس بعض مجبوریوں کی وجہ سے ان کی اس وصیت پر عمل نہیں ہو سکا۔ اس کا خواجہ حسن نظامی کو بڑا قلق تھا۔ اکبر جب بھی الہ آباد میں رہتے رہتے گھبرا جاتے تو دہلی کا رُخ کرتے اور یہاں بہت خوش رہتے۔ اسی لیے ان کے انتقال کا سب سے زیادہ صدمہ خواجہ صاحب کو ہوا۔ انھوں نے اکبر کی زندگی کے حالات لکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس وہ اسے پورا نہ کر سکے، مگر انھوں نے اکبر پر کئی مضامین لکھے۔ اپنے اور پنڈت ہرکشن پرشاد کول کے نام کے خطوط شائع کیے جن سے اکبر کی زندگی اور ان کے خیالات اور شاعری کے بارے میں بڑی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

اکبر کے لطیفے

اکبر اپنی شاعری میں اور گفتگو میں لوگوں سے ہنسی مذاق کرتے تھے اور ہنسی ہنسی میں بعض اوقات بہت گہری اور کام کی باتیں کر جاتے تھے۔ اکثر شام کو ان کے گھر محفل جمتی اور لوگ اکبر کی مزے دار گفتگو سننے کے اشتیاق میں جمع ہوتے۔

ایک طالب علم جو اس زمانے میں میور سینٹرل الہ آباد میں زیرِ تعلیم تھے اکبر سے بہت محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ اکبر سے ملنے ایک دن ان کے گھر گئے۔ اکبر بہت محبت سے ملے ان سے باتیں کیں اور چنے کا حلوہ ان کو کھلانے لگے۔ طالب علم کھانے میں تکلف کر رہے تھے۔ اکبر نے کہا: "ارے میاں کھالو، ہمیں تو تم بھول جاؤ گے مگر یہ حلوہ یاد رہے گا۔" یہ طالب علم

ملک کے مشہور عالم اور ادیب ڈاکٹر سید عابد حسین تھے۔

اسی طرح ایک دن ایک صاحب اکبر سے ملنے آئے۔ اکبر اس وقت گھر میں تھے۔ ان صاحب نے اپنا کارڈ بھیجا تھا جس پر ان کے نام کے آگے بی اے بھی لکھا تھا۔ اکبر نے کارڈ کی دوسری طرف ان کو یہ مصرع لکھ کر بھیج دیا کہ ؎

آپ بی اے پاس ہیں تو بندہ بی بی پاس ہے

گاندھی جی کی نان کوآپریشن یا تحریک عدم تعاون کا زور تھا۔ حکومت کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہو رہی تھی۔ اکبر کے پاس صوبے کے کمشنر مسٹر کورج کی یہ فرمائش آئی کہ آپ چونکہ حکومت سے پنشن پاتے ہیں۔ اس لیے حکومت کے خلاف اس تحریک کی مخالفت میں آپ کو شعر کہنے چاہئیں۔ اکبر کو یہ بات ناگوار گذری اور اس کا اظہار انھوں نے اس طرح شعر میں کیا ؎

بھرتے ہیں میری آہ کو فونو گراف میں
کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شب برات کا دن تھا۔ اکبر کے یہاں سب ملنے والے جمع تھے۔ ان میں ایک صاحب جو بہت باتیں کر رہے تھے۔ ہنسی مذاق کر رہے تھے اور اکبر سے یہ فرمائش بھی کرتے جاتے تھے کہ آج شب برات ہے۔ شب براتی دلوایئے۔ جس طرح عید میں عیدی ملتی ہے۔ اکبر نے پہلے تو انھیں بہت ٹالا مگر جب وہ کسی طرح چپ نہ ہوئے اور بار بار یہی فرمائش کیے گئے۔ تو اکبر نے ان کو شعر میں یہ جواب دیا ؎

تحفۂ شب برات میں کیا دوں
میری جاں تم تو خود پٹاخہ ہو

وہ صاحب بہت جھینپے اور مدتوں لوگ ان کو یہ شعر سنا سنا کر چھیڑتے رہے۔

اکبر کو عجیب عجیب باتیں سوجھتی تھیں۔ ایک دفعہ حسب دستور کسی صاحب نے ان کو خط میں قبلہ لکھا۔ اکبر نے ان کو جواب دیا کہ "آپ نے تو مجھے "قبلہ" لکھا جو مسلمانوں کے لیے سب سے

قابلِ احترام جگہ سمجھی جاتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آپ کو کیا لکھوں۔ یہی ہو سکتا ہے کہ میں "وعلیکم السلام یا جامع مسجد" لکھ دوں۔

اکبر اپنے شعروں میں عجیب عجیب قافیہ لاتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے شبلی کا قافیہ "قبلی" لکھا تھا اسی طرح کے ایک مشہور لیڈر سیف الدین کچلو چند دوستوں کے ساتھ اکبر سے ملنے آئے۔ شدید گرمی تھی اور لو بھی چل رہی تھی۔ اکبر کو جب یہ معلوم ہوا کہ کچلو ملنے آئے ہیں تو تو انھوں نے فوراً یہ شعر کہہ دیا۔

کوئی جا کے کہہ دے کچلو سے

ہم سب ہوئے ہیں زچ لو سے

۱۹۱۰ء کا ذکر ہے، دہلی کے مشہور حکیم اجمل خاں نے اور شہر کے معزز لوگوں نے اوکھلے نہر کے کنارے اکبر کی دعوت کی۔ وہاں کے بند کو دیکھ کر اکبر کہنے لگے " انگریز بھی خوب ہیں جمنا کی آزادی کو بھی چھین لیا اور اس پر بندھ باندھ دیا۔" ایک صاحب نے کہا کہ "جمنا ہی کیا، گنگا کو بھی کاٹا ہے، اور جس انجینئر نے گنگا کو کاٹا ہے اس کا نام کاٹلی ہے" تو اکبر نے بے ساختہ یہ مصرعہ پڑھا۔ ؎

کاٹلی صاحب نے گنگا کاٹ لی

سب بہت ہنسے اور پھر خواجہ حسن نظامی بولے " جناب جہاں آپ کھڑے ہیں اسی جگہ جلال الدین خلجی نے کیقباد کو ڈبو دیا تھا اور اس طرح سے خاندانِ غلاماں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا تھا تو اکبر نے دوسرا مصرعہ پڑھا۔ ؎

غلامی یہاں ڈوبی تھی، آزادی بھی یہیں سے اُبھرے گی

پنڈت موتی لال نہرو سے اکبر کی اچھی ملاقات تھی۔ انھوں نے اکبر سے کہا آپ نے تو اپنے گھر کا بہت اچھا نام رکھا ہے، یعنی "عشرت منزل" ہمارے گھر کا بھی کوئی اچھا سا نام تجویز کیجئے۔" اکبر بولے " پنڈت جی کیا مشکل ہے۔ آپ عشرت منزل کا ہندی ترجمہ کر لیجیے۔ یعنی اپنے

گھر کا نام "آنند بھَون" رکھ دیجیے۔ پنڈت موتی لال نہرو بہت خوش ہوئے اور اس طرح الہ آباد کی اس تاریخی عمارت کا نام اکبر کا رکھا ہوا ہے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی۔

چھٹا باب

اکبر اور گاندھی جی

آزادی کی تحریک میں جب گاندھی جی شریک ہوئے تو اس کا رُخ ہی بدل گیا۔ گاندھی جی نے انگریزوں سے بے ہتھیاروں کے لڑائی لڑنے کی ٹھانی اور قتل و غارت وغیرہ کی شدید مخالفت کی۔ شروع میں یہ بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی، مگر رفتہ رفتہ زیادہ تر لوگ گاندھی جی کے ساتھ ہو گئے۔ گاندھی جی نے عدم تعاون اور سودیشی کی تحریکیں چلائیں۔ یہ زمانہ اکبر کی زندگی کا آخری زمانہ تھا۔ وہ بہت بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ اکثر بیمار بھی رہتے تھے، مگر انگریزوں کے خلاف ہندوستانی اب اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اس بات سے اکبر بہت خوش تھے۔ انھوں نے اس زمانے کی سیاست کے بارے میں گاندھی جی کے بارے میں بہت سے اشعار کہے ہیں، اتنے کہ ان کو ایک کتابی صورت میں ان کے انتقال کے بعد شائع کیا گیا اور اس مجموعے کا نام "گاندھی نامہ" رکھا گیا ہے۔ یہ نام خود اکبر نے تجویز کیا تھا۔ گاندھی جی کے بارے میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

انقلاب آیا، نئی دُنیا، نیا ہنگامہ ہے
شاہنامہ ہو چکا، اب دَورِ گاندھی نامہ ہے

ملیں اور پھول اس کی باتیں سنتے ہیں۔

اِس شعر سے اُس خوشی کا اظہار ہوتا ہے جو اکبر کو گاندھی جی کے سیاست میں آنے اور انگریزوں سے ٹکر لینے کی تھی۔ ایک جگہ انھوں نے کہا ہے۔

آگے تمھارے رنگ کسی کا جما نہیں
جے ہو تمھاری اے میرے گاندھی مہاتما

یا

بھائی گاندھی کا نہایت ہی مقدس کام ہے
رام پوری[1] ساتھ ہیں اور رام ہی کا نام ہے

گاندھی تو ہمارا بھولا ہے اور شیخ نے چرلا بدلا ہے
دیکھو تو خدا کیا کرتا ہے، صاحب نے تو دفتر کھولا ہے

گاندھی کی تحریک عدم تعاون پر بھی اکبر نے بہت سے اشعار کہے ہیں۔ کہیں مزاحیہ انداز میں، کہیں سنجیدہ انداز میں۔ گاندھی جی کی اس بات کو جو عدم تعاون کی تحریک کی جان ہے کہ آزادی بغیر خون بہائے، بغیر ظلم و تشدد کے لینی ہے۔ اکبر نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

نہ صاحب کو مارو، نہ صاحب سے بھاگو
مچاتے رہو غل، پیٹو اور مانگو

یا

لشکرِ گاندھی کو ہتھیاروں کی کچھ حاجت نہیں
ہاں مگر بے انتہا صبر و قناعت چاہیئے

---

[1] مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جو رام پور کے رہنے والے تھے۔ اس زمانے میں گاندھی جی کے ساتھ کانگریس میں تھے۔

اُدھر بپھرے ہوئے صاحب ہیں اور زور ہُوائی ہے
اِدھر روٹھے ہوئے گاندھی ہیں شکوہ ہے ڈھٹائی ہے

گورمنٹیوں میں بڑی عقل ہے
مگر ان میں ایکا نہیں ہے نہ جوش
جو ہیں گاندھوی وہ ہیں اکثر اُجڈ
مگر اک اُمنگ ان میں ہے اور جوش

سرگاندھی کو اُڑانے سے گورمنٹ ڈری
شور ہر سمت سے اُٹھے گا کہ آندھی آندھی

اکبرؔ نے گاندھی جی کی تحریک کے بارے میں تعریفی اشعار کہے ہیں۔ ان اشعار میں اپنے بوڑھے اور کمزور ہونے کی وجہ سے ان کی تحریک میں حصہ نہ لینے کی معذرت بھی کی ہے۔

تجربہ ترک تعاون کا کریں یہ نونہال
گور میں جو پاؤں لٹکائے ہوئے ہیں ان کو کیا

اکبرؔ یہ سمجھتے تھے کہ ہم کو آزادی اس وقت مل سکتی ہے اور گاندھی جی کی یہ تحریکیں اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہیں جب ہندوستان کے لوگ اپنے آپس کے اختلافات کو ختم کردیں اور مل کر اس کی جدوجہد کریں۔ کیونکہ انگریزوں کی طرف سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر الگ الگ کرنے کی کوشش جاری تھی۔ اِس لیے اکبرؔ کہتے ہیں ؎

حالات مختلف ہیں ذرا سوچ لو یہ بات
دشمن تو چاہتے ہیں کہ آپس میں لڑ مرو

اِسی لیے وہ ہندوستانیوں کو "میں میں" کرنے کی بجائے "ہم" بننے کی ہدایت دیتے ہیں ؎

تفرقوں کے یہ جو طوفاں ہیں بپا کچھ کم تو ہوں
ہم کو کرنا چاہیئے سب کچھ مگر "ہم" ہم تو ہوں

اِسی کے ساتھ اکبر اس کا احساس بھی دلاتے ہیں کہ ذلّت کی غلامی زندگی کو کسی طرح قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ ؎

حضور عرض کروں مَیں جو ناگوار نہ ہو
وہ یہ کہ مَوت ہی بہتر ہے جب وقار نہ ہو

اکبر کا آخری زمانہ اور انتقال

اکبر کی چہیتی بیوی فاطمہ صغرا کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوگیا۔ اکبر اس کے بعد نو دس برس زندہ رہے، مگر یہ زمانہ بہت تکلیف کا گزرا۔ ان کے بیٹے عشرت حسین تو اپنی ملازمت کے سلسلے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الٰہ آباد سے باہر رہتے تھے۔ بس اکبر تھے اور ان کے چھوٹے بیٹے ہاشم۔ وہ بہت چھوٹے تھے۔ ان کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی تھی۔ اکبر نے اپنی حالت کو اس شعر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے ؎

اب تک ہے انھیں حالتِ سابق کا تصوّر
یاروں نے مِرا خانۂ ویراں نہیں دیکھا

اسی زمانے میں انھوں نے یہ شعر بھی کہا تھا ؎

مایوس ہوں باغِ عالم میں، دل ہے نہ اب کِھلتا ہے
عشرت کے لیے کافی ہے دعا، ہاشم کا خیال البتہ ہے

مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چار پانچ سال بعد ہاشم بھی خدا کو پیارے ہو گئے اور اکبر بالکل تنہا رہ گئے۔ اب ان کی عمر ستر برس کے لگ بھگ تھی، صحت بہت کمزور ہو گئی تھی اور غموں نے انھیں اور بھی کمزور اور ناتواں کر دیا تھا۔ لوگ اکبر سے ملنے اب بھی آتے تھے۔ مگر ان میں ایسے

لوگ اب کم رہ گئے تھے جو اکبر کے دوست اور ہم خیال تھے۔ جو آتے بس دل بہلانے اکبر کے پاس آتے۔ جب اکبر کو غمگین اور افسردہ دیکھتے تو جلدی ہی چلے جاتے۔ تھوڑے دنوں کو عشرت کے پاس چلے جاتے۔ وہاں بھی دل نہ لگتا اور واپس آجاتے۔ کبھی کبھی اکبر کو یہ خیال بھی ستاتا کہ انھوں نے اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ اس سے وہ اور افسردہ ہوجاتے اور خدا سے دعا مانگتے، خدا ان کو جلد اب اِس دنیا سے اُٹھا لے۔

۱۹۱۸ء میں وبائی انفلوئنزا پھیلا، جو بہت خطرناک تھا۔ اکثر لوگ اس میں مبتلا ہو کر مرجاتے تھے۔ اکبر کو بھی بخار آیا مگر وہ ٹھیک ہوگئے تو انھوں نے یہ شعر کہا ؎

کمزور ہے میری صحت بھی کمزور میری بیماری بھی
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مَر نہ سکا

وہ بہت کمزور ہوگئے تھے، کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا، مگر دماغ آخری وقت تک کام کرتا رہا۔ بڑھاپے میں تنہائی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ یہ احساس اکبر کو بھی تھا۔ زمانہ بدل رہا تھا اس کے طور طریقے بدل رہے ہیں۔ ایک تہذیب ختم ہو رہی ہے! ایک نسل جا رہی ہے دوسری نسل اس کی جگہ لے رہی ہے۔ یہ تبدیلیاں لازمی ہیں۔ انھیں ہونا چاہیئے۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی ان تبدیلیوں کو جن بوڑھے لوگوں کو دیکھنا ہوتا ہے ان کو اس کا رنج ہونا لازمی ہے۔ اس دُکھ کا اظہار اکبر کے ان اشعار میں ملتا ہے ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ مُلکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
بدل جائے گا اندازِ طبائع[1] دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے سامانِ غم ہوں گے
کسی کو اس تغیّر[2] کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

---

[1] طبیعت کی جمع [2] تبدیلی

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ[1] روئے صنم ہوں گے

پھر وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلّی دیتے ہیں ؎

تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبؔر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

اسی لیے اکبر نے اس زمانے میں جو اشعار کہے ان سے افسردگی کا اظہار ہوتا ہے ؎

خوش دلی سے اب تعلق مجھ سے ہے ٹوٹا ہوا
عمر بھی گزری ہوئی ہے دل بھی ہے ٹوٹا ہوا

اپنے غم خانے کا دروازہ کرو بند اکبؔر
اپنے نہیں کوئی سوا موت کے آنے والا

آخر کو اکبر کی دعا خدا نے سن لی۔ ۹ ستمبر جمعہ کے دن ۱۹۲۱ء میں مختصر سی بیماری کے بعد اکبر خدا کو پیارے ہو گئے۔ مرنے سے پہلے بے ہوشی کے عالم میں بھی وہ نماز اور قرآن شریف پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے وقت ان کے عزیز دوست خواجہ حسن نظامی ان کے پاس ہی تھے۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر لوگ جمع ہونے لگے۔ حالانکہ بارش بہت تیز ہو رہی تھی، مگر اکبرؔ کے جنازے میں بہت سے لوگ شریک تھے۔ دوسرے دن اخباروں میں اکبرؔ کے انتقال کی خبر بجلی کی طرح پھیل گئی اور ان کے بیٹے کے پاس لوگ آنے لگے خطوں اور تاروں کا تانتا بندھ گیا۔ خط بھیجنے والوں میں سرکاری حکام جن میں ہندوستانی بھی تھے اور انگریز بھی۔ سیاسی لیڈر، ادیب اور شاعر بھی تھے۔

اس زمانے کے مشہور رسالے "زمانہ" کے ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم نے عشرت حسین

---

[1] پردہ

کو لکھا:

"جناب اکبر کی وفات سے آپ کے سر سے ایک شفیق باپ کا سایہ نہیں اُٹھا بلکہ اُردو شاعری کا چراغ گُل ہو گیا۔ جو ترقی ان کے طرز کو ان کے دم سے حاصل ہوئی اس کی مثال اردو شاعری کے کسی دَورِ گذشتہ میں نہیں ملتی ہے۔ یہ طرز مرحوم ہی کے ساتھ اردو شاعری میں ختم ہو گیا۔"

اُس وقت کی مشہور ہستی سر جگدیش پرشاد نے لکھا:

"مَیں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ ملک سے ایک لاثانی بزرگ اُٹھ گیا۔ مرحوم کا کلام، مرحوم کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا:

"حضرت اکبر کی رحلت نہیں ہوئی اردو لٹریچر کی دولت اُٹھ گئی۔"

اور سب سے اچھا خط ڈاکٹر اقبال نے لکھا تھا:

"ہندوستان بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت تقریباً ہر حیثیت سے بےنظیر تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بہت بخیل ہے۔ زمانہ سینکڑوں سال گردش کرتا ہے جب آکے ایک اکبر اسے ہاتھ آتا ہے۔ کاش اس انسان کا فیض اس بدقسمت ملک اور اس کی بدقسمت قوم کے لیے کچھ اور عرصہ جاری رہتا۔"

ان خطوط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر اور ان کی شاعری کی کیا اہمیت ہے۔ جو اس دنیا میں ہے اسے جانا ہے، مگر وہ لوگ جو اس میں اگر خدا کے بندوں کے لیے کچھ کر جاتے ہیں، اس دنیا کو خوبصورت اور پُرامن بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں اچھی اچھی باتوں کو پھیلائیں، سچ کا ساتھ دیں، ظلم و ناانصافی سے لڑیں۔ یہ لڑائی وہ کبھی تلوار سے لڑتے

لے بے مثال لے کنجوس

ہیں، کبھی اپنے قلم سے۔ اکبر بھی ان لوگوں میں سے تھے جو اس دنیا سے اُٹھے تو کچھ کر کے اُٹھے۔
اس لیے ان ہی کا یہ شعر ان پر پورا اترتا ہے ؎

اکبر کے جو مرجانے کی خبر ساقی نے سنی تو خوب کہا
مرنا تو ضروری تھا ہی لے رندوں کے لیے کچھ کر بھی گیا

اُردو شاعری میں اکبر کی اہمیت

اکبر کی شاعری اُردو شاعری میں اپنے طرز کی الگ ڈھنگ کی شاعری ہے۔ ان سے پہلے بھی طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں شعر کہے جاتے تھے، مگر اکبر نے جس طرح کے شعر کہے وہ طنز و ظرافت کے اچھے نمونے کہے جا سکتے ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اکبر نے طنز و ظرافت کا جو معیار قائم کیا تھا آج بھی کوئی اس معیار کو نہیں پہنچ پایا ہے۔

اصل میں طنزیہ و مزاحیہ شاعری دیکھنے میں بہت آسان ہے مگر طنز و مزاح کے اچھے نمونے پیش کرنا مشکل ہے۔

اکبر کی شاعری کی اہمیت کو پوری طرح سمجھا نہیں گیا۔ ایک تو ان کے بارے میں یہ خیال ہو گیا کہ اکبر قدامت پرست ہیں اور چونکہ ان کو سر سید سے بعض باتوں میں اختلاف تھا اس لیے بھی لوگ ان کو ترقی کا مخالف سمجھنے لگے۔ پھر چونکہ انہوں نے اپنی شاعری کا طرز مزاحیہ اور طنزیہ رکھا تھا اس لیے بھی لوگوں نے اس کی طرف اتنا دھیان نہیں دیا جتنا دینا چاہیئے۔

اکبر کی شاعری کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستانی لوگوں کو ان کے مذہب، ان کی تہذیب، ان کے ملک کی عظمت کا احساس دلائیں اور اس طرح اس مہم کو ناکام بنائیں جو انگریز ہندوستانیوں کو خود ان کی نظروں سے گرانے کی کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اس خیال کو پیش کیا کہ ہمیں ترقی کرنا چاہیئے اس لیے کہ اس سے بالکل رشتہ توڑ کے ہماری وہی حالت ہو جاتی جو کسی درخت کی اس کی جڑ کے بغیر ہوتی ہے۔ اس خیال کو اکبر نے اپنے اشعار میں

پیش کیا ہے ؎

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا
موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو تمھیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا
موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں؟

یا

درخت جڑ پہ ہے قائم تو استوار بھی ہے
کبھی خزاں ہے کبھی موسم بہار بھی ہے
جو کوئی چاہے کہ قائم کرے نئی بنیاد
تو برگ و بار نہ آرد درخت بھی برباد
طریقِ حکمت و تزئیں ہر ایک رنگ میں ہے
نہ سمجھو یہ کہ فقط مغربی ہی ڈھنگ میں ہے
تمہارے دل میں یہ کیا وہم کیا گماں آئے
تمہارے جسم میں کیوں دوسروں کی جاں آئے

پھر اکبر نے طنز و مزاح کے پردے میں انگریزوں پر خوب خوب چوٹیں کیں۔ اس زمانے میں جب ہر طرف ان کا رعب داب تھا۔ ؎

اگرچہ ظلم سے دل مائلِ فریاد ہوتا ہے
مگر کہنا ہی پڑتا ہے بجا ارشاد ہوتا ہے

تمہارے فریادیوں کو دیکھا، تمہارے عذرات بھی سنے ہیں
خفا نہ ہو جاؤ تو یہ پوچھوں کسی کا دل تم سے شاد بھی ہے

لہ تقریر ؎ غائب

اکبر نے اپنی شاعری میں ہندوستانیوں کو میل ملاپ سے رہنے کی تاکید کی اور بار بار یہ بتایا کہ ہم لوگ ایک ہیں۔ یہ انگریز ہم میں اختلافات پیدا کر رہے ہیں کہ ہم آپس ہی میں لڑتے رہیں اور یہ ہم پر حکومت کرتے رہیں۔ اسی لیے یہ کبھی مذہب کے نام پر کبھی زبان کے معاملے میں ہمیں آپس میں لڑواتے ہیں۔ اس طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم میں آزاد ہو کر اپنے ملک پر حکومت کرلے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔

اکبر ترقی کے مخالف نہیں تھے اور وہ اس بات کے خلاف تھے کہ ہندوستانی اپنی "ہندوستانیت" چھوڑ دیں اور انگریزی تہذیب کو اختیار کر کے انگریزوں کا سایہ بن جائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ :

نہیں آزاد جو اپنوں سے تعلق کرے قطع
وہ ہے آزاد جو غیروں کا گرفتار نہ ہو

اکبر نے اپنی شاعری میں بار بار اپنی غلامی کی زندگی کی مذمت کی ہے :

کہا صیاد نے بلبل سے کیا تو نے نہیں دیکھا
کہ تیرے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے
کہا اس نے اسے تسلیم کرتی ہے نظر میری
نشاط طبع کو مہلک مگر بیکاری پر ہے

پھر اکبر کی شاعری کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ ہم ان کی شاعری میں اس دور کی سماجی، سیاسی اور تمدنی زندگی کی تصویر بہت اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔

اکبر کو سرسید کی تعلیمی اور سماجی اصلاحات سے کچھ اختلاف تھا مگر وہ ادب میں جس طرح کی تبدیلیاں چاہتے تھے اکبر اس سے متفق تھے اور اپنی شاعری میں وہ ان تبدیلیوں سے بہت متاثر ہیں۔ ان کی شاعری کو پڑھ کر آسانی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کی شاعری میں نئے رجحانات ملتے ہیں۔

اس طرح ہم کہتے ہیں کہ اکبر ایک بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی اہمیت وقت کے ساتھ کم نہیں بلکہ بڑھتی ہی جائے گی اور اردو ادب میں اکبر کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

بچوں کا ادب

1	اردو کی کہانی (احتشام حسین کی کتاب کا ہندی ایڈیشن)	سید احتشام حسین	6.25
2	ان سے ملے	منوہر ورما / طلعت عثمانی	300
3	ایک دن کا بادشاہ	اطہر پرویز	5.50
4	ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ	اطہر پرویز	5.00
5	اچھی چڑیا	محمد شفیع الدین نیر	3.00
6	باپو اور بچے	پی۔ ڈی ٹنڈن / تاجور سامری	2.25
7	بچوں کے نہرو	ایم۔ چلاپتی راؤ / پریم نرائن	7.50
8	بچوں کی نظمیں	جگن ناتھ آزاد	200
9	بنک کی کہانی	غلام حیدر	4.50
10	بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ اول)	محمد قاسم صدیقی	3.00
11	بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ دوم)	محمد قاسم صدیقی	3.00
12	بھارت کی لوک کتھائیں (حصہ سوم)	محمد قاسم صدیقی	3.00
13	ننھی جل پری (ناروجین زبان سے راست ترجمہ)	ہانس کرشیان / ہرچرن چاولہ	3.70
14	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ اول)	کے۔ شیوکار / اطہر پرویز	5.75
15	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ دوم)	کے۔ شیوکار / اطہر پرویز	5.75
16	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ سوم)	کے۔ شیوکار / اطہر پرویز	5.75
17	پنچ تنتر کی کہانیاں (حصہ چہارم)	کے۔ شیوکار / ساحر ہوشیارپوری	7.00
18	پودوں اور جانوروں کی دنیا	اطہر پرویز	2.50
19	پھول مالا	سعادت نظیر	2.50
20	رابنسن کروسو	ڈینیل ڈیفو / م۔ ندیم	3.40
21	راجہ رام موہن رائے	سچندر لال گھوش / انعام الحق	3.50

22	سرسید احمد خاں (دوسرا ایڈیشن)	میر نجابت علی رسید ابوالحسنات	1.00
23	شریف زادہ	مرزا بادی رسوا رمرتبہ: حفیظ عباسی	5.00
24	عقل مند مچھیرا اور دوسرے ڈرامے	مرتبہ: م۔ ندیم	2.20
25	فٹ بال کی کہانی	راج نرائن راز	6.00
26	گاندھی جی کے مختلف روپ	انو بندھو پادھیائے رشکیل اختر فارو	3.00
27	مشینی گھوڑا (دوسرا ایڈیشن)	اطہر پرویز	5.00
28	مولانا روم کی کہانیاں	مرتبہ: محمد حفیظ الدین	2.00
29	ناگ منی	ساوتری رسلمیٰ اجمیری	3.00
30	نورتن کہانیاں	انتخاب اور بازگوئی: شمیم احمد	6.50
31	خط کی کہانی	غلام حیدر	3.75
32	گلستاں کی کہانی	مرتبہ:۔ امیر حسن نورانی	4.00
33	بچوں کی مسکان	سیدہ فرحت	3.75
34	نہرو کے ان دیکھے روپ	پی۔ ڈی ٹنڈن رنورالحسن نقوی	13.00
35	رتن ناتھ سرشار	پریم پال اشک	4.25
36	صبح کی پری	رتن سنگھ	3.00
37	دیس دیس کی کہانیاں (دوسرا ایڈیشن)	اطہر پرویز	2.00
38	محمد حسین آزاد	نند کشور وکرم	5.00
39	ہندوستان کی آبادی	محمد ابوذر	8.75
40	فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور	4.25
41	آرٹ کی کہانی	سیما پرویز	3.25
42	ٹلی پٹ کا سفر (دوسرا ایڈیشن)	جوناتھن شولفٹ رم۔ ندیم	2.10